میجر (ریٹائرڈ) ڈاکٹر محمد خاں اشرف۔ جتنا میں انھیں جانتی ہوں

ڈاکٹر عظمت رباب

Dr. Azmat Rubab

Associate Professor, Department of Urdu,

Lahore College Univeristy for Women, Lahore.

Abstract:

Maj (r) Dr Muhammad Khan Ashraf has led a varied and eventful life.He has been accurately described as "Sahib e Saif o Qalam" by Dr A B Ashraf,.He served in PakArmy with great distinction: was declared best all round cadet in PMA;Was awarded "Sitar e Jur,rat"in war, Was slected for British Army Staff College, Camberley UK. After retirement he joined Education and was awarded "The Best University Teacher Award "by the Federal Govt.He has written more than 30 books many of which serve as text and reference books at M.Phil and Ph.D level. All this is known to every one but few know about the man himself. I have the honour and distinction of being his student , a research scholar ,a literary assistant a research associate and finally a colleague of him.So I have the privilege of knowing him from many side. Now I choose to write about him "As I know Him"to give a new insight into his personality.

اردو ادب میں محمد خاں اشرف مختلف جہات کے حامل ہیں۔ وہ بیک وقت نقاد، محقق، مرتب و مدوِن،، مترجم، ماہرِ تعلیم ،سیاسی و عسکری تبصرہ نگار اور سب سے بڑھ کر ایک استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ عسا کرِ پاکستان کے حوالے سے میں نے ان کی شخصیت کو منتخب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف مقالہ نگاران کی کسی نہ کسی ادبی، عسکری یا تعلیمی تصنیف کے حوالے سے متعلقہ تصنیف کا تجزیہ کریں گے۔ وہ شخصیت جوان سب کے پس پردہ موجود ہے اس کی چند خصوصیات بیان کرنا مقصد ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں اشرف صاحب نے جو بھی میدان اپنے لیے منتخب کیا اس میں بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تعلیم کے میدان میں کامیاب طالب علم کے روپ میں ابھرے، فوج میں ۲۰ سال (۱۹۸۷ء۔۱۹۶۷ء) ملازمت کی اور میجر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے ، اس دوران میں پی۔ ایم۔ اے کاکول ، ۱۹۶۷ء آل راؤنڈ کیڈٹ اول پوزیشن، سگنل کورس: ۱۹۶۹ء،

AY+، آفیسر وپین اور ٹیکٹکس کورس: ۱۹۷۴ء، B+Y+ ، کمپنی کمانڈر کورس: ۱۹۷۵ء، A,Y+، سٹاف کالج کیمرلے، یو۔کے، ۱۹۷۸ء، B+ کے فوجی اعزازات حاصل کیے۔ بہادر یہ کے میدان میں بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرنے پر ستارۂ جرأت سے نوازے گئے۔ان کی تصنیف ''جرأت کے ستارے'' میں انھوں نے جہاں ۸ بلوچ کے کارنامے بیان کیے ہیں وہیں ان کی بہادری کے قصے بھی موجود ہیں جو اگر چہ مجموعی طور پر بیان کیے گئے ہیں لیکن ان میں واضح طور پر محمد خاں اشرف کی انتظامی اور عسکری صلاحتیں دکھائی دیتی ہیں۔اسی طرح تعلیم کے میدان میں آئے تو انھوں نے اپنی تصانیف، ادبی نظریات، تدریس اور تحقیق سے کئی نئے سنگِ میل کی بنیاد رکھی۔فوج سے وابستگی کی بنا پر ان کا ذکر جامعات میں اب بھی میجر صاحب ہی کہہ کر کیا جاتا ہے۔

میجر صاحب سے میرا تعلق تقریباً چوبیس ۲۴ سال پر محیط ہے۔اس عرصے میں مَیں نے ان کی شاگرد، معاون اور رفیق کار کے طور پر ان سے بہت کچھ سیکھا، ان کی شخصیت کے کئی درمجھ پر وا ہوئے۔میں اپنی تمام کامیابیوں کا کریڈٹ انھی کو دیتی ہوں کیونکہ ان کی رہنمائی اور مشاورت میں، میں نے کامیابیوں اور ترقی کی منازل طے کی ہیں۔میں نے ۱۹۹۵ء میں ایم۔اے اردو میں جی سی میں داخلہ لیا۔سالِ دوم میں میجر صاحب نے ہمیں تنقید کا پرچہ پڑھانا تھا، تنقید تو پتا نہیں سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن ایک سخت گیر منتظم کا پہلا تاثر اس وقت ابھرا جب انھوں نے کلاس کے دوران ہی شامتِ اعمال بلائے ہوئے ایک گارڈ کو کلاس روم کے دروازے سے گزرتے ہوئے روک لیا اور اسے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔وہ بے چارہ چپ کر کے سنتا رہا اور میں بہت مکدر دل کے ساتھ یہ سوچتی رہی کہ انھوں نے کلاس پر رعب ڈالنے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے۔بہت بعد میں جا کر یہ پتا چلا کہ ان کے ذمے اتنے انتظامی کام ہوتے تھے کہ وہ کسی کام کو التوا میں نہیں رکھتے تھے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ انھی کو ڈانٹتے ہیں جن کی بھلائی انھیں مقصود ہوتی ہے۔جی سی میں دیگر اصلاحات کے علاوہ انھوں نے سیکیورٹی گارڈز کے لیے جو سروس سٹرکچر ترتیب دیا وہ ان کے لیے بہت مفید تھا۔میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ کوئی شخص کتنے ہی بڑے عہدے سے سبک دوش کیوں نہ ہو، ریٹائرمنٹ کے بعد جب وہ اپنی سابقہ جائے ملازمت پر جاتا ہے تو اس کے لیے وہ سب لوگ اجنبی ہو جاتے ہیں۔لیکن میجر صاحب پر یہ فارمولا لاگو نہیں ہوتا۔وہ بہت کم جی سی جاتے ہیں لیکن جب کبھی جاتے ہیں تو ان کی عزت پہلے کی طرح ہی ہوتی ہے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ۔(پہلے کی عزت میں احترام کے ساتھ عہدے کو سلام کی مجبوری بھی شامل ہوتی ہے)۔سر اس بات پر خود بہت حیران ہوتے ہیں اور خوش بھی۔

یہ ان کی مخصوص عادت ہے جو گزرتے وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوتی جا رہی ہے کہ جب وہ اپنے حصے کا کام کر لیتے ہیں تو اپنے معاون یا معاونین سے انھیں یہ توقع ہوتی ہے کہ بس اب کام ختم ہو جائے جیسے تیسے کر کے۔ اگر انھیں یہ عذر پیش کیا جائے کہ کام کا معیار اس جلد بازی سے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ کوئی کام اور انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا۔جو غلطیاں ہوں گی اگلے ایڈیشن میں درست کر لیں گے۔مجھے اعتراف ہے کہ ان کی اس عادت نے بہت سے کام بروقت مکمل کرا دیے ورنہ میرے اختیار میں ہوتا تو شاید اب بھی زیرِ التوا ہی رہتے۔(جیسا کہ اب بھی بہت سے پراجیکٹ نامکمل اور ادھورے رکھے ہوئے ہیں)۔

میجر صاحب کے نام کے بارے میں ہم کبھی کبھار انھیں یہ کہہ کر چھیڑتے ہیں کہ محمد خان تو اپنے زمانے کا مشہور اور

بدنامِ زمانہ ڈاکو تھا۔ تو وہ ہنس کر کہتے ہیں کہ اسی لیے اس کے نام پر میرا نام رکھا گیا تھا کہ لوگ ڈرتے رہیں اور دور دور رہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس حکمتِ عملی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ میجر صاحب انتظامی عہدے پر ہوں، تدریسی فرائض انجام دے رہے ہوں یا کسی تحقیق و تدوین کے کام میں مصروف ہوں ان سے مشورہ لینے اور مدد چاہنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ میں نے جی سی میں بارہا کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم فِل اقبالیات کے لیے اپلائی کر دو کیونکہ اس وقت تک جی سی یا اورینٹل کالج میں ایم فِل کی کلاسز کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت کے لحاظ سے یہ مشورہ بہترین تھا۔ ان کے بعض مشورے بظاہر اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ ان کے عملی ہونے پر شک وشبہ ہونے لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار صائمہ ارم ان سے گھریلو اخراجات کے مقابلے میں خرچ کی تنگی کا ذکر کر رہی تھی، اور اس نے بہت ہی پریشانی کے عالم میں کہا کہ کیا کروں خرچے پورے ہی نہیں ہوتے تو ڈاکٹر صاحب نے بے ساختہ کہا :تو مت خرچ کرو۔ خرچے پورے ہو جائیں گے۔ اس بات پر ہکا بکا ہو کر ہم دونوں ان کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن وہ اپنی مخصوص سنجیدگی سے اس مشورے کو دہرا رہے تھے۔ آج بھی دوستوں کی محفل میں ہم ان کی اس بات کو یاد کرتے ہیں تو بے ساختہ قہقہے بلند ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو انھیں ان لوگوں کو بھی پرخلوص مشورے دیتے دیکھا ہے جو منافق تھے، جھوٹے تھے اور مطلب پرست تھے۔ اس بات کا ادراک میجر صاحب کو بھی بخوبی ہوتا تھا، بعض اوقات میں ان سے اس بات پر الجھ پڑتی تھی کہ آپ کو پتا ہے کہ فلاں شخص آپ کے خلاف کتنی بکواس کرتا ہے اور آپ ہیں کہ اسے اچھے مشوروں سے نواز رہے تھے تو وہ اپنی بے نیازی والی مسکراہٹ سے کہتے تھے کہ بھئی ہمارا کیا جاتا ہے۔ اگر اس مشورے سے اس کا بھلا ہو جائے تو اچھی بات ہے، اور مجھے کسی نے کیا نقصان پہنچانا ہے۔ یہ ایک بڑی صفت ہے جو انسانوں اور انسانیت سے محبت کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو حسین، ذہین، بے باک (اور کسی حد تک بدتمیز) لوگ پسند ہیں۔ چونکہ شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اس لیے شعر سے محبت کرنے والوں کو بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ شاید اپنے زمانۂ طالب علمی میں جس قسم کے طالب علم تھے، اب بطور استاد انھیں ایسے شاگرد بھاتے ہیں جو ذہین بھی ہوں، بحث و مباحثہ میں پیش پیش ہوں، بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتے ہوں اور دوسروں سے اختلافِ رائے کو دلائل سے پیش کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود جس نکتے پر اڑ جاتے ہیں وہ اس پر قائم رہتے ہیں اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ یہی حال ان کا لوگوں کے بارے میں تاثر کا ہے، کسی شخص کا جو تاثر ان کے دل و دماغ میں نقش ہو جاتا ہے وہ اسے اسی انداز سے دیکھتے ہیں، ذکر کرتے ہیں اور اپنے تاثر پر قائم رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جو تاثر قائم کرتے ہیں، ان کے تجربے، عقل، مشاہدے اور ذہانت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور زیادہ تر درست ہی ہوتا ہے۔ میں ان کے ایک کولیگ اور اپنی ایک کولیگ کی مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جی سی میں وہ اپنے ایک کولیگ کے بارے میں اپنے مخصوص لطیف انداز میں بتاتے تھے کہ اس شخص کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی کے پاؤں پکڑنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اب ہم ٹھہرے بڑے استادوں کی ظاہری حالت پر جانے والے بے خبر اور ''معصوم'' لوگ، ہم بہت شد و مد سے ان کی اس بات کی تردید کرتے تھے اور دل ہی دل میں کہتے جاتے تھے کہ دیکھو بھلا سر بھی جس کے بارے میں جو رائے قائم کر لیں اس سے ہٹتے نہیں ہیں۔ خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ صائمہ اور میں ڈاکٹر صاحب کے ڈائریکٹرز آفس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہی صاحب ہانپتے کانپتے تشریف لائے اور اپنے کسی طالب علم کا مسئلہ لے کر آئے، ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں، رنگ

سرخ تھا، ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ انھیں ہارٹ اٹیک اب ہوا کہ تب۔ ہم دونوں دوستیں سانس روک کر سارا معاملہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ باقاعدہ منت سماجت پر اتر آئے۔ ہم ان کا یہ روپ دیکھ کر حیران تھے۔ جب سر نے انھیں او کے رپورٹ دی کہ اب ان کے اور طالب علم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے تو وہ فوراً سے پہلے نارمل ہو گئے اور ہنس ہنس کر ڈاکٹر صاحب کو وہ قصہ سنانے لگے جس میں انھوں نے اپنے باس کے خلاف باتیں کی تھیں اور پھر باس کے استفسار پر ان کے پاؤں پکڑ کر انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اسی طرح میری اس عادت پر کہ میں لوگوں پر بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں، وہ مجھے سمجھاتے رہتے تھے اور مجھے حسبِ معمول ان کی یہ باتیں سمجھ میں تو کیا آتیں، بری لگا کرتی تھیں اور میں خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا اور کہنا ہے کہ کام کرنے والی جگہ یعنی جاب میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا، اس لیے سب سے اچھے تعلقات رکھو، دوسروں کے کام آؤ، اپنا کام محنت سے بروقت مکمل کرو اور کسی سے توقعات وابستہ نہ کرو کیونکہ سروس میں لوگ دوست نہیں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔ مجھے گزرتے وقت نے یہ تلخ سبق دیا کہ وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ درست فرماتے ہیں کہ لوگوں کو سمجھاتے رہو کہ آگے پتھر ہے، ٹھوکر لگے گی اور گر جاؤ گے لہٰذا سنبھل کر چلو لیکن لوگ نہیں مانتے اور پھر جب آگے بڑھتے ہیں، پتھر سے ٹکراتے ہیں، زخم کھاتے ہیں تو انھیں یاد آتا ہے کہ استادِ محترم درست ہی فرماتے ہیں۔ لوگ اپنے تجربوں سے اور ٹھوکریں کھا کر سیکھتے ہیں، دوسروں کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

ڈاکٹر صاحب کی حسین یادوں میں ان کے اورینٹل کالج اور دوستوں کے ساتھ گزارے گئے وقت اور ادبی بحث مباحثے شامل ہیں۔ (۱۹۶۳ء۔۱۹۶۱ء) وہ ادبی بحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کا پانچ دوستوں کا گروپ تھا جس میں اے۔ بی۔ اشرف، ملک حسن اختر، غلام قادر آزاد، ارشد کیانی اور ڈاکٹر محمد خاں اشرف تھے۔ اے۔ بی۔ اشرف اور ڈاکٹر صاحب کے ناموں میں اشرف کے اشتراک کی وجہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ انھیں ''اشرفین'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ملک حسن اختر کا انتقال ہو چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس گروپ کے دیگر اراکین روزگار کے سلسلہ میں ملک اور بیرونِ ملک کے طول وارض میں پھیل گئے لیکن ان کا ایک دوسرے سے رابطہ ہے اور کبھی کبھار چیدہ چیدہ ملاقات بھی ہو جاتی ہے لیکن ایسا ابھی تک نہیں ہو سکا کہ سب افراد ایک جگہ ایک وقت مل سکیں۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف گذشتہ کئی دہائیوں سے ترکی میں مقیم ہیں تاہم سال میں ایک یا دو بار جب وہ پاکستان تشریف لاتے ہیں تو لاہور میں اپنے دوست ڈاکٹر اشرف کے گھر ہی قیام کرتے ہیں، اس دوران میں بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہوتا ہے کہ یار میں تم سے ملنے آیا ہوں، اور کسی سے باتکلف ملاقات نہیں کروں گا۔ میری اور صائمہ کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پسندیدہ ملاقاتیوں میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ غلام قادر آزاد مانچسٹر یو۔ کے میں مقیم ہیں، چند ماہ پہلے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ارشد کیانی کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے بہت سنا ہے لیکن ان کے بقول ان کا کوئی اتا پتا نہیں کہ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آج کل گیریژن یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں اور تحقیق وتصنیف میں مصروف ہیں۔ ان کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر اس سلسلے میں تعطل آ جائے تو انھیں زندگی میں خلا محسوس ہونے لگتا ہے، پھر وہ زندگی و دنیا سے بیزار دکھائی دیتے ہیں، ہوا سے بھی لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور خواہ مخواہ بلاوجہ چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دوست احباب انھیں یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنا سلسلۂ تدریس وتصنیف جاری رکھیں تاکہ ان کی ذہنی وجسمانی صحت برقرار رہے۔

اورینٹل کالج کی یادوں میں چند حسین و رنگین یادیں بھی شامل ہیں۔ مخلوط تعلیم کے سبب چند لڑکیاں بھی ایم۔اے کی کلاس میں شامل تھیں، ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف اپنے اور دوستوں کے قصے سناتے ہوئے جب ڈاکٹر اشرف کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ بھئی ہم میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی کی زلفوں کا اسیر تھا لیکن کبھی اشرف صاحب کو اس معاملے میں الجھا ہوا نہیں پایا تو صائمہ اور میں ایک بلند آہنگ شرارتی قہقہے کے ساتھ یہ اضافہ کر دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے معاشقے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی ہوگی۔ وہ تعلقات کے حوالے سے اب بھی ایسے ہی محتاط ہیں، آپ ان سے اس موضوع پر گفتگو کر کے دیکھ لیں وہ اپنے دلائل سے آپ کو بھی قائل کر لیں گے کہ انھوں نے کبھی کسی کے ساتھ سنجیدہ قسم کا معاشقہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ ہاں البتہ چند حسینائیں ایسی تھیں جو ان کی محبت و تعلق میں مبتلا تھیں، یہی وجہ ہے کہ موصوف میں عاشق سے زیادہ محبوبیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ چاہنے سے زیادہ چاہا جانا انھیں پسند ہے۔

محمد خاں اشرف سے ان کی تشنہ خواہشات کا پوچھا جائے تو وہ انتہائی انکساری سے جواب دیتے ہیں کہ میری سب خواہشات اللہ کے کرم سے پوری ہوئی ہیں، میں نے اپنی مرضی کی تعلیم حاصل کی، اپنی پسند کے شعبوں میں ملازمت کی، اولاد کی نعمت سے رب نے نوازا ہے اور اب بھی اپنی مرضی سے زندگی گزارتا ہوں۔ اس میں ایک جملے کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جتنا اور جس قدر وہ چاہتے تھے انھیں وہ ملا اور جو نہیں ملا وہ ان کی خواہش میں شامل نہیں تھا ورنہ ان کی سعادت بختی کے باعث یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خواہش کریں اور انھیں وہ حاصل نہ ہو سکے۔

اگر سر کے آئیڈیل کے بارے میں بات کی جائے تو میرا خیال ہے کہ ان کی والدہ محترمہ ان کی آئیڈیل شخصیت ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کی ماں نے ہر سرد و گرم میں انھیں اپنی محبت کے پروں کے نیچے چھپائے رکھا، خود مشکلات برداشت کیں لیکن اپنی اولاد کو ہمیشہ اچھا کھلایا پلایا اور انھیں اچھی نصیحت کی۔ وہ مانا نوالہ کی خواتین کی بے جی تھیں، بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی تھیں، کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کی اشیا سے ان کی مدد کرتی تھیں، صبح سویرے جاگ جاتی تھیں، دودھ بلو کر لسی بناتیں، مکھن نکالتیں، بچوں کو سکول کے لیے جگاتیں، وہ گرما گرم پراٹھے بناتیں اور ہمیں کھلا کر وہ خوش ہوتیں۔ ان پراٹھوں کا ذائقہ شاید آج بھی ڈاکٹر صاحب کو یاد ہے۔ ان کی والدہ نے ہمیشہ اپنے کام خود کیے، کبھی کسی سے نہیں کہا۔ ان کی یہ صفت بھی ان کے لاڈلے بیٹے کو بہت محبوب ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کی فرمائش اور ضد پر آخری دنوں میں وہ ان کے پاس لاہور آئی ہوئی تھیں، ورنہ وہ اپنے گھر، گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کو چھوڑ کر آنے کو کبھی تیار نہ ہوتی تھیں۔ باتھ روم میں گرنے کی وجہ سے انھیں چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ رات کو باتھ روم میں جانے کے لیے وہ کسی کو نہ جگاتیں، بیٹے کے ناراض ہونے پر انھوں نے کہا کہ کاکا! سارا دن کام کر کے تھک کے واپس آتے ہو، اب میں تم لوگوں کی نیند کیسے خراب کرتی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی خواہش کے مطابق انھیں مانا نوالہ سپردِ خاک کیا گیا۔ اپنی والدہ کو یاد کرتے ہوئے اور ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے آج بھی اشرف صاحب کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔ اپنے والد صاحب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھیں ہم سے بہت محبت تھی لیکن روایتی راجپوتوں کی طرح کبھی محبت کا براہِ راست اظہار نہیں کرتے تھے، ہاں ہمیں سوتے میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمیں چوم رہے ہیں، پیار کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاید اسی بات کا ردِعمل تھا کہ میں نے اپنی اولاد کو پیار کرنے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

میجر صاحب اپنے والدین کی پہلوٹھی کی اولاد تھے اس لیے بہت لاڈلے تھے لیکن اس لاڈ پیار نے انھیں بگاڑا نہیں بلکہ ان میں ایک احساسِ ذمہ داری پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے بہن بھائیوں سے شفقت سے پیش آتے ہیں اور وہ روایتی انداز میں ان کی اس محبت کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کے باوجود وہ ان سے محبت اور سرپرستی کا رویہ اپنائے رکھتے ہیں۔ بزرگوں کی بہت سی باتیں وقت گزرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں، شاید ان کے بہن بھائیوں کو بھی ان کی محبت کا احساس جلد ہو جائے۔ اپنے پرائے، چھوٹے بڑے سبھی کے لیے وہ شفقت کا مخصوص انداز روا رکھتے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ بڑا بن بن کر اور بڑے پن سے اکتا کر کبھی کبھار ان کا جی چاہتا ہوگا کہ ان کی دیکھ بھال اور خیال چھوٹے کی طرح رکھا جائے، ایسا کرنے پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ لاشعوری طور پر ہی ہوتا ہے ورنہ کسی کی مجال ہے کہ گھوڑے واہ راجپوت کے بڑے پن کو کوئی چیلنج کرے۔ ان کا ہر چھوٹا بڑا اسی بڑے پن کا شکار ہے جو ان کے خون میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب لاکھ کہیں کہ مجھ میں راجپوتوں والا تفاخر نہیں ہے لیکن ان کا خفتہ راجپوت کبھی کبھار بہت زور سے انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے (اگرچہ ایسا ہوتا بہت کم ہے لیکن جب ہو جائے تو بس پھر، اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینا تو معمولی بات ہے اس سارے قصے میں)

ایک بہت عجیب بات یہ ہے کہ اپنے تجربے، عقل یا الہام و وجدان کی بنا پر وہ کسی شخص یا کسی واقعے کے نتائج کے بارے میں پہلے سے خبردار کر دیتے ہیں۔ میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ انھوں نے مجھے کسی بات یا کام کرنے سے منع کیا اور بتایا کہ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے تئیں اپنی عقل و سمجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ کام کیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا۔ میرے حیران کُن استفسار پر وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے تو یہ سب ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہو، تم نے اسے مانا ہی نہیں تو میں نے کہا چلو کر کے دیکھ لے، شاید نتیجہ حسبِ منشا نکل آئے لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ ہوتا وہی ہے جیسا وہ فرماتے ہیں۔ گھر کے معاملات ہوں یا پروفیشن کے، کوئی نفسیاتی الجھن ہو یا مالی، وہ اس کا حل پیش کر دیتے ہیں، ہمارے لیے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو لیکن نتیجہ مشورے کے مطابق ہی نکلتا ہے۔ (مان لینے میں فائدہ ہی ہوتا ہے لیکن انسانی خصلت اور خاندانی اکڑ کبھی کبھار آڑے آ ہی جاتی ہے اور پھر نقصان بھی خود ہی کو ہوتا ہے)

بطور استاد ان کی ایک خصوصیت مجھے بہت پسند ہے اور میں کوشش کرتی ہوں کہ ان کے جیسا طرزِ عمل اختیار کروں۔ وہ اپنے پرائے کی تخصیص کے بغیر سب کی راہنمائی کرتے ہیں، درست مشورہ دیتے ہیں۔ شاگرد غلط سلط جیسا کام کر کے لائیں انھیں علم ہوتا ہے کہ کام خود ہی کرنا ہے، ایسا نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب انھیں اسائنمنٹ لکھ کر دیں یا مقالہ تحریر کر کے دیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایم۔فل کے مقالے کے دوران اپنا پہلا باب میں نے چھ ماہ میں مکمل کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ میرا ایم فل یا پی ایچ ڈی کا مقالہ انھوں نے لکھا یا ہماری مشترکہ کتابوں میں میرا حصہ محض نام کا ہے۔ یہ بات وہ لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو جانتے نہیں۔ اگر جانتے تو ایسی بات نہ کرتے۔

ڈاکٹر اشرف کی ایک عادت جو مجھے بہت ناپسند ہے اور جس پر کئی بار ناپسندیدگی کا برملا اظہار کر چکی ہوں۔ باقی لوگ ان کی اس عادت پر ان سے دور ہو جاتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ بہت شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں، ہر کسی کے کام آنے کی ممکنہ کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہمدردی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور عملی مدد بھی کرتے ہیں۔ لیکن کسی رنجش یا ناراضی کے باعث کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو کبھی نہیں بھولتی اور ہمیشہ ایک خلش بن کر کدورت کا باعث بنتی ہے۔ وہ ناراضی کا اظہار

کرنے کے بجائے لاتعلقی اختیار کر لیتے ہیں، بظاہر ٹھیک ٹھاک نارمل لیکن رویوں میں ابنارمل۔ میری طرح کے وہ لوگ جوان سے محبت کرتے ہیں وہ ان کی اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن عام لوگ ان کے اس رویے کو بھولتے نہیں۔ میں اپنی مثال سے آپ کو یہ بات سمجھاتی ہوں۔ ایک بار کسی بات پر ناراض ہو کر مجھ سے کہنے لگے: تم میں ایسی کون سی خاص بات ہے، تم بھی میری شاگرد ہو باقی شاگردوں کی طرح۔ چند گھنٹوں یا چند دنوں کے بعد ان کا غصہ تو جاتا رہا لیکن ایک ''کینہ پرور شاگرد'' کی طرح یہ بات میرے دل ہی میں رہی۔ اس کے بعد میں نے دیگر تعلقات کے حوالے سے بھی بارہا اس کا مشاہدہ کیا کہ ان کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی ہے۔ وہ ان کے بہن بھائی ہوں، دوست احباب ہوں، کولیگز ہوں یا شاگردان کی ساری محبت وشفقت کو بالائے طاق رکھ کر وہ چند ذاتی جملوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود ذکر کرتے ہیں کہ فوج کی ملازمت کے دوران ایک افسر نے ان کی اے۔سی۔آر لکھی تو اس میں ان کی تعریفوں کے پُل باندھنے کے بعد یہ جملہ لکھا:

But some times he does not care for other feelings

میرے رائے کے مطابق یہ وہی بات ہے جو میں نے اوپر تحریر کی ہے۔

اشرف صاحب کی ایک اور خصوصیت (میں تو خصوصیت ہی کہوں گی) یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ دوستی یا لحاظ کو کسی حد تک مدِ نظر رکھتے ہیں اور آسانیاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی رائے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کے پاس پی ایچ ڈی کے کئی مقالات جانچ کے لیے جامعات سے بھیجے جاتے ہیں۔ وہ ان پر استادانہ ہمدردانہ نقطہ نظر سے رائے دیتے ہیں لیکن جہاں انھیں واضح خرابی دکھائی دے جائے اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور اس خامی کو دور کرنے کی تجویز بھی دیتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود اصرار کیا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ کی جو مرضی ہے کر لیں لیکن میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اس بات سے بھی ان کی مخالفت میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں یہ رجحان ہو کہ ذاتی تعلقات کے پیشِ نظر انتہائی منفی یا انتہائی مثبت رپورٹیں تحریری صورت میں پیش کر دی جائیں، وہاں ایسی صاف گوئی اور راستی لوگوں سے کہاں برداشت ہوتی ہے۔

ان میں نمود ونمائش کا مادہ بالکل نہیں پایا جاتا۔ انھیں کسی دنیاوی عہدے یا اعزاز کا لالچ نہیں ہے۔ وہ شاعر ہیں لیکن مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں شاندار جرأت کا مظاہرہ کیا اور ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازے گئے، بہترین یونیورسٹی ٹیچر کا اعزاز دیا گیا، تین درجن سے زائد کتابوں اور پچاس سے زائد مضامین کے مصنف، مرتب، مترجم اور مؤلف ہیں لیکن اس پر کبھی تفاخر کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے علم اور قابلیت کو عملی طور پر ثابت وظاہر کرتے ہیں۔ ان کے شاگردان کا دم بھرتے ہیں، ان کی کتابیں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی نصاب کا حصہ ہیں، ان کے تنقیدی نظریات اردو ادب میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ادب، تنقید، تحقیق اور تدوین پر اپنا ایک جداگانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ سب کے لیے آسانیاں کرتے ہیں اور ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ یہی ایک بہترین استاد اور اچھے انسان کی خصوصیات ہیں۔ باقی چیزوں کی فکر نہ انھیں پہلے کبھی تھی اور نہ آج ہے۔

ان کی عمر ماشاءاللہ ۷۸ برس ہو گئی ہے لیکن وہ اپنی وضع قطع سے اور چاق وچوبند رہنے کی بنا پر ۶۰ برس سے زیادہ کے نہیں لگتے یا شاید اس سے بھی کم۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی سیر اور ورزش کی عادت ہے اور دوسرے کھانے پینے میں اعتدال کا رویہ۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں جب تک واک کرتا رہوں، جسمانی اور ذہنی طور پر تندرست رہتا ہوں، جب اسے ترک کر دوں

میرے سارے معمولاتِ زندگی ڈسٹرب ہو جاتے ہیں ۔ بہت سے نظریات اور شاعری ان کی اس واک کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔ان کے بقول میری ساری شخصیت اس دوران میں مرتکز ہوتی ہے اور میں اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ خوشی اور سکون کے لمحات ہوتے ہیں ۔ گذشتہ کچھ عرصے سے گھٹنوں میں تکلیف کے باعث وہ واک کے لیے باقاعدگی سے پارک میں نہیں جا سکے (جوان کے گھر کے قریب ہی ہے) تاہم وہ اپنے گیراج ہی میں چہل قدمی کر لیتے ہیں ۔ میں نے کبھی انھیں بے تحاشا کھاتے پیتے نہیں دیکھا، وہ ایک مخصوص مقدار میں کھانا لیتے ہیں اور اس کو جلدی سے کھا کر فارغ ہو جاتے ہیں ۔ان کے برعکس میں بہت آہستگی سے کھاتی ہوں اور بہت کھاتی ہوں ۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ وہ کھانے کو زندہ رہنے کا ذریعہ سمجھ کر کھاتے ہیں اور اس کی پریکٹس انھیں فوج کے دوران ہوئی کیونکہ وہاں کھانا بھی ڈیوٹی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اب کبھی کبھار (بہت کم) وہ کہتے ہیں کہ میں نے کھانا انجوائے کر کے کھایا ہے (کھانے سے محبت کرنے والے لوگوں کے ساتھ رہیں گے تو یہ تو ہوگا)

جیسی وِل پاور ڈاکٹر صاحب کی ہے میں نے ابھی تک اور کسی میں نہیں دیکھی ۔ وہ کسی کام کا ارادہ کر لیں تو پھر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں چاہے اس میں اپنا دم ہی کیوں نہ نکل جائے (میرے منہ میں خاک ،محاورۃً کہہ رہی ہوں)ان کا کہنا ہے کہ انسان جب کسی کام کو کرنے کا تہیہ کر لے تو پھر اسے اچھے طریقے سے کرنا چاہیے بلکہ بہترین طریقے سے ۔فوج میں تھے تو بے شمار اعزازات حاصل کیے، انتظامی امور میں آج بھی جی سی میں کی گئی بے شمار اصلاحات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔ انھوں نے جی سی میں ۱۹۹۵ء سے ۲۰۱۲ء تک کا عرصہ تدریس اور انتظامی عہدوں میں گزارا۔ جی سی کو طلبہ یونین تنظیموں سے پاک کر کے ایک خالصتاً تعلیمی ادارہ بنانے میں ان کی اس وِل پاور کا بہت ہاتھ ہے ۔ وہ اس پراجیکٹ پر لگے رہے اور بالآخر ڈاکٹر خالد آفتاب کی سرپرستی میں اس کام کو انجام دیا۔ اوول کو خوبصورت بنانے میں ان کی کوششوں کا عمل دخل ہے ۔ٹرانسپورٹ ہو یا سکیورٹی کا مسئلہ سبھی لاینحل سمجھے جانے والے معاملات کو میجر صاحب نے یوں سلجھایا کہ ان کے بعد آنے والوں کو کوئی مشکل پیش نہ آئی ۔تقریباً دو سال پہلے ایسا ہوا کہ ان کے گھٹنوں میں مسئلہ ہوا، ڈاکٹرز نے آپریشن اور گھٹنے بدلوانے کی تجویز دی ۔اب میجر صاحب نے ٹھان لی کہ وہ اسے ورزش اور دواؤں ہی سے ٹھیک کریں گے، دن رات میں پانچ چھے بار گھٹنے کی ورزشیں، اس کی تھراپی اور دواؤں سے انھوں نے چند ماہ ہی میں اس خرابی کو دور کر لیا۔ مشرقی پاکستان کی پاک بھارت جنگ میں چند افراد اور ہتھیاروں کی مدد سے بھارتی فوج کو مشکل میں ڈالے رکھا اور آخر وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے ۔ (تاوقتیکہ انھیں فوجی احکامات نہیں آئے)

ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے ۔ نہ صرف اردو بلکہ انگریزی ادب پر بھی انھیں عبور ہے ۔اردو کے استاد ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے شاگردوں اور استادوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اردو ادب سے محبت کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو والوں کو انگریزی بھی آنی چاہیے کیونکہ اردو میں زیادہ تحریکیں اور نظریات انگریزی ادب سے آئے ہیں ۔ہم جب تک اوریجنل متن نہیں پڑھیں گے، تب تک ہمیں اردو ادب بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہ تنقید کے جدید نظریات جدیدیت، پس جدیدیت ، وجودیت ، ساختیات ، پس ساختیات وغیرہ پر عبور رکھتے ہیں اور اس حوالے سے مضامین بھی تحریر کر چکے ہیں ۔ غالب ان کے پسندیدہ شاعر ہیں، وہ غالب کے اشعار حوالے کے طور پر موقع محل کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں ۔ جنگ میں ان کا بایاں کان زخمی ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بائیں کی نسبت دائیں کان سے بہتر سماعت کر سکتے ہیں ۔اس بات کو غالب کا

شعر پڑھ کر دوسروں کو محظوظ کرتے ہیں:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

صائمہ کو اور مجھے ''طفلانِ خود معاملہ'' کہتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

تو پست فطر ت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند

اسی طرح ہمارے ذمے کوئی کام ہو اور ہم نہ کریں یا انھیں کسی بات پر مایوسی ہو تو کہتے ہیں:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت، مگر، ملے

آخر میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ جینئس لوگ معاشرے میں ہمیشہ اَن فِٹ رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے عہد کے لیے نہیں بنے ہوتے، انھیں آنے والے زمانے زیادہ اچھا سمجھ اور سراہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف بھی ہمارے معاشرے کے ایسے نابغہ روزگار (Genius) ہیں جنھیں ہم جیسے محدود سوچ رکھنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ پاک ان پر اپنا کرم فرمائے، انھیں زندگی و صحت عطا فرمائے اور وہ اپنے عزیز و اقارب، احباب، شاگردوں اور انسانیت کے لیے یونہی چھتنار سایہ بنے رہیں۔ آمین۔

☆.....☆.....☆